© rasailojaraid.com

التفسیر، مجلس تفسیر، کراچی جلد ۹، شمارہ ۱۸، اپریل تا ستمبر ۲۰۱۲ء

خواجہ غلام فرید آف کوٹ مٹھن شریف اور ان کے منتخب علمی آثار

ڈاکٹر محمد شکیل اوج

Khawaja Ghulam Farid of Kot Mittahan Sharif is well-known as a great sufi, scholar, and a linguistic poet. His mother tongue was siraiki. Apart from siraiki his published works and books of poems are also in urdu and persian, for those explicated commentaries has been written. He was the author of several scholarly books. On them the pronouncements were written, presented to him in his presence and afterwards they were published as well. This anthology has been titled as Maqabees-ul-Majalis. He possessed the mastery over several sciences and skills. However, in this article his scholarly testimonials are selected which are related to Quran.

خواجہ غلام فرید آف کوٹ مٹھن شریف ۲۳ ذوالحجہ ۱۲۶۱ھ مطابق ۲۳، دسمبر ۱۸۴۵ء بروز منگل قبل از طلوع آفتاب، ساعت مشتری میں اپنے وقت کے جید عالم اور معروف صوفی بزرگ خواجہ خدا بخشؒ المعروف محبوب الٰہی کے گھر تولد ہوئے، ان کا تاریخی نام خورشید عالم (۱۲۶۱ھ) رکھا گیا، جبکہ بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ سے سلسلۂ نسبت کے باعث ان کا نام غلام فرید تجویز کیا گیا اور پھر اسی نام سے آپ نے شہرت پائی۔(۱)

خواجہ غلام فریدؒ کی شہرت تو ہفت زبان شاعر کی حیثیت سے ہے، ان کے تین دیوان، سرائیکی، اردو، فارسی مطبوعہ ہیں جب کہ نثر میں مناقب فریدیہ، مناقب محبوبیہ، فوائد فریدیہ اور رسالہ مسالک فریدی بھی مطبوعہ ہیں، آپ کے ملفوظات اشارات فریدی (فارسی) بھی طبع ہوئے تھے جن کا ترجمہ مقابیس المجالس کے نام سے موجود ہے، خواجہ فرید نے اپنے سرائیکی دیوان کی کافیوں کی ترتیب احادیث شریفہ سے اسماء الرجال کی طرز پر خود فرمائی تھی جیسا کہ ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

> ''ایں ترتیب ردیفات در دیوان کافیات خود کہ نہادہ ام از احادیث شریفہ وسوق و ترتیب اسماء الرجال اخذ کردہ ام، اگر کروڑہا کافی تصنیف شود ایں ترتیب تمام نخواہد شد) ترجمہ: اپنے دیوان میں کافیوں کی ترتیب احادیث شریفہ اور اسماء الرجال کی ترتیب سے اخذ کرکے میں نے خود دی ہے اگر کروڑہا کافیاں لکھی جائیں پھر بھی یہ ترتیب ختم نہ ہوگی''(۲)

خواجہ غلام فرید نے آٹھ سال کی عمر میں قرآن حفظ کرلیا تھا، وہ خداداد قوت حافظہ کے مالک تھے، بچپن میں ہی ان کی یادداشت کا یہ عالم تھا کہ قرآن مجید کے چار چار رکوع روزانہ یاد کرکے استاد کو سناتے تھے، اور پھر ایک دن خود ہی اپنی یادداشت و حافظے کا امتحان اس طرح لیا کہ ایک حافظ صاحب سے کہا کہ آج میں ایک پارہ یاد کرکے سناؤں گا اور پھر واقعی ڈھائی گھنٹے میں یاد کرکے سنادیا اور ایک غلطی بھی نہ نکلی۔(۳)

اسی طرح آج سے ۸۰ سال پہلے علامہ نسیم طالوت (ڈیروی) دیوان فرید پر اپنے طویل ترین مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ ''خواجہ فرید دو گھنٹے میں مولوی لطف علی کی تصنیف ''سیف

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسلوک'' کا ایک جز یاد کر لیتے تھے''(۴)

خواجہ غلام فرید نے مسند سجادگی (۱۲۸۸ھ) سنبھالتے ہی مسند تدریس بھی سنبھال لی، مقابیس المجالس کے مختلف مقبوسوں سے اخذ کر کے ماہر فریدیات علامہ سعیدی نے لکھا ہے کہ خواجہ فرید نحو، معانی و بدیع، فقہ، میراث، کلام، حدیث و تفسیر کی منتہی کتب خود پڑھاتے تھے اور جن کتب کے نام مقابیس سے ملے ہیں وہ یہ ہیں، شرح ملا جامی، شرح چغمینی، مطول، مختصر المعانی، شرح عقائد نسفی، ہدایہ، میراث میں سراجی اور تصوف میں ست مراتب، تحفہ مرسلہ، لوائح جامی، فصوص الحکم اور حدیث میں ترمذی اور مشکوٰۃ شریف وغیرہ۔(۵)

خواجہ غلام فرید اگرچہ روایتی مدرسے سے پڑھے ہوئے تھے مگر انہیں تاریخ، جغرافیہ اور متعدد سائنسی علوم پر بھی دسترس حاصل تھی اور ان کے ملفوظات اس کی گواہی دے رہے ہیں، نیز ان کی علمی شان بیان کرتے ہوئے علامہ سعیدی لکھتے ہیں، خواجہ فرید کے ملفوظات عرف عام کے روایتی ملفوظات سے قطعاً جداگانہ ہیں، اگر ان ملفوظات کو علوم میں تقسیم کیا جائے یعنی کونسا مقبوس کس علم سے متعلق ہے تو یہ کہنا درست ہوگا کہ خواجہ فرید ۴۵ علوم میں کامل دسترس رکھتے تھے (موصوف نے ان علوم کی فہرست بھی دی ہے) یعنی ہر مقبوس کسی نہ کسی علم کی نمائندگی کرتا ہے، ملفوظات کے مطالعہ سے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ آپ علم کی ریاست کے شہنشاہ تھے، یہی وجہ ہے کہ وقت کے نابغہ روزگار علماء و فضلاء ان کی مجلس درس میں شاگرد بن کر بیٹھتے تھے، بیشک وہ اپنے وقت کے مجتہد بلکہ مجدد تھے۔(۶)

خواجہ فرید کے عالمانہ تفوق کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ ریاست بہاولپور کے چیف جسٹس سید محمد نواز شاہ کی تحریک (رولنگ) پر جون ۱۸۸۹ء مطابق ۳ شوال ۱۳۰۶ھ کو نواب آف بہاولپور کے محل کے ایک حصے میں ایک علمی مناظرہ (علم الحقائد پر) کرایا گیا، جس میں ہندوستان سے شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اور مولانا خلیل احمد انبٹھویؒ ایک فریق کی حیثیت سے جبکہ مقامی علماء میں مولانا غلام دستگیر اور مولانا سلطان محمود دوسرے فریق کی حیثیت سے شریک تھے یعنی دونوں طرف سے جبال العلم شخصیات شریک مناظرہ تھیں، اس مناظرہ میں بطور منصف و حکم جس شخصیت کا طرفین سے متفقہ انتخاب ہوا وہ شخصیت خواجہ غلام فرید کی تھی۔(۷)

مقابیس المجالس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ غلام فرید نے متعدد معروف و معتبر کتب کے بعض مندرجات کو عقلاً و نقلاً غلط ثابت کیا ہے، مثال کے طور پر وہ مولانا عبدالحئی لکھنویؒ کے مجموعہ فتاویٰ کے بعض فتووں کو بھی قلم کی زد میں لائے ہیں، مثلاً وہ فتویٰ جو حضرت ابن عباس کے ایک قول (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چھ مثل) کے حوالے سے ہے خواجہ فرید نے اسے قرآن کریم، طبیعیات اور جغرافیہ کی مدد سے مرجوح قرار دیا ہے، پھر ارباب ملت اور ارباب نحل (ارباب مذہب و ارباب فلسفہ) میں تفریق کر کے دونوں کے فکری، نظریاتی ماخذ و مراجع میں بعد المشرقین ثابت کیا ہے، یعنی بطلیموس اور نیتا غورث کے فلکیاتی اور جیالوجیکل نظریات میں فرق کو بھی واضح کیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ اہل ملت کے ماخذ میں بہت سی اشیاء کا ذکر موجود ہے اور ان کے وجود پر اہل ملت کو اقرار بھی ہے لیکن اہل نحل ان چیزوں کے وجود کے قائل نہیں ہیں جیسے جبل کوہ قاف، سد سکندری، یاجوج و ماجوج، چشمہ آب حیات وغیرہ، مگر اہل ملت ان کے قائل ہیں، اگرچہ نہ مشاہدہ میں ہیں اور نہ عالم ناسوت سے متعلق ہیں۔ پھر قول ابن عباس میں ''فی کل ارض'' سے کیا مراد ہے، ارباب نحل تو صرف ایک زمین کے قائل ہیں، اگر یہ کہا جائے کہ قطعات (سات براعظم) کے اعتبار سے سات زمینیں ہیں تو پھر ان قطعات میں پہلے پیغمبروں کی بعثت کو ثابت کرنا پڑے گا، اگر ''ولکل قوم ھاد''(الرعد/۷) کے مطابق وہاں پیغمبر مبعوث ہوئے بھی ہوں جیسا کہ خیال ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام ریڈ انڈینز کے نبی تھے، تو بھی آنحضرت ﷺ کے عہد میں کسی پیغمبر کی بعثت کو تسلیم نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ آنحضرت کا ام القریٰ یعنی دنیا بلکہ کائنات کے وسط و مرکز میں مبعوث ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ آنحضرت ﷺ عالمگیر نبی ہیں، عالمگیر نبی کی موجودگی میں ان کی مثل کسی دوسرے نبی کا ہونا ممکن ہی نہیں ہے ورنہ آیت ''وما ارسلنک الا رحمۃ للعلمین''(الانبیاء/۱۰۷) کا بطلان لازم آئے گا، اسی لیے آنحضرت کا ایک صفاتی نام ''امی'' بھی ہے جس کا ایک معنی میری دانست میں یہ ہے کہ کرۂ ارض کے مرکز میں رہ کر ساری دنیا کو نور نبوت سے منور کرنا۔(۸)

خواجہ فرید میں ایک خاص بات یہ تھی کہ وہ ہر بات کو قرآن کے نقطۂ نظر سے دیکھتے تھے مثلاً زمین کے اندر پانی کی سطح کا ایک جگہ پر قائم رہنا، جسے علماء ارضیات 'واٹر لیول' کا نام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دیتے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ زمین کے اندر پانی کی جو سطح بلند ہوتی ہے وہ دراصل بارش پانی ہوتا ہے، مگر خواجہ فرید نے زمین کے اندر پانی کی سطح بلند ہونے کا سبب پوربی (جنوب مشرقی) ہوا کو قرار دیا ہے (پورب لمباوے پتالوں پانی آوے) (۹) اور اس پر قرآن سے دلیل موجود ہے "وقیل یا ارض ابلعی ماءک ویسماء اقلعی وغیض الماء وقضی الامر" (ہود/۴۴) اور فرمایا گیا اے زمین اپنا پانی جذب کر لے اور اے آسمان (بادل) برسنے سے تھم جا اور پانی خشک ہوگیا اور کام کا فیصلہ ہوگیا۔ یعنی حکم الٰہی پر پہلے زمین نے اپنی پشت پر موجود سارا پانی نگل لیا حالانکہ اس وقت بارش برس رہی تھی، بعد ازاں بادلوں کو برسنے سے رکنے کا حکم ہوا، اگر علماء ارضیات کے نظریۂ واٹر ٹیبل (کہ زمین کے اندر پانی کی سطح ایک جگہ پر ہی قائم رہتی ہے) کو سامنے رکھا جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ (باختلاف روایات) چالیس دنوں پر محیط طوفان کا پانی آخر زمین میں کچھ نہ کچھ تو جذب ہوا ہوگا اور زمین میں پانی کی سطح لازماً بلند ہوئی ہوگی، پھر چالیس دنوں کا بے پناہ طوفانی پانی زمین کس طرح نگل گئی؟ اصل بات یہ ہے کہ زمین کے اندر پانی کی سطح کا بلند یا نیچے ہو جانا موسم اور ہوا کا محتاج ہے، موسم گرما میں جب لو چلتی ہے تو پانی کی سطح نیچے ہو جاتی ہے اور پوربی ٹھنڈی ہوا چلتی ہے تو سطح بلند ہو جاتی ہے۔

علامہ سعیدی، خواجہ فرید کے نظریہ کی مزید تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں، "یہ بات یہ ہے کہ بارش کا پانی مختلف شکلوں میں تقسیم ہوکر مخلوق خدا کے کام آتا ہے، اللہ تعالیٰ نے زمین کو ایسی حکمت سے تخلیق فرمایا ہے کہ اس کی سطح میں پانی کو جذب کرنے والی ایکوفرز (Aquifers) ہیں یہ ایکوفرز اگرچہ موٹی تہہ والی ہیں لیکن اپنے اندر پانی کی ایک خاص مقدار ہی جذب کر سکتی ہیں، اس کے نیچے جو دوسری ایکوفرز ہیں وہ اپنے اندر پانی جذب ہی نہیں کر سکتیں، جبکہ پہلی ایکوفرز ایک خاص مقدار جذب کر سکتی ہیں تو نظریہ واٹر ٹیبل قابل بھروسہ نہ رہا، اس کے مقابلے میں خواجہ فرید نے جو کچھ فرمایا ہے، مشاہدہ، تجربہ اور قرآن اس کی تائید کرتا ہے۔(۱۰)

علم نحو کی مشہور کتاب "شرح ملا جامی" میں افعال مقاربہ کی بحث پڑھاتے وقت جب یہ عبارت آئی کہ لفظ "طفق" بھی افعال مقاربہ میں سے ہے، تو خواجہ فرید نے یہ آیت پڑھی

"وطفقا یخصفٰن علیھما من ورق الجنة" (الاعراف/۲۲) اور وہ دونوں لپیٹنے لگے اپنے جسم پر جنت کے پتے(۱۱) پھر فرمایا کہ:

"حضرت آدم اور بی بی حوا علیہا السلام شجر ممنوعہ چکھنے کے بعد اپنا ستر بہشتی پتوں سے چھپانے لگے، اب سوال یہ ہے کہ شجر ممنوعہ چکھنے کے بعد انہیں اپنا جسم چھپانے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ ظاہر ہے کہ چکھنے سے مراد زن وشوہر والا تعلق قائم کرنا ہے، ان کی اس لغزش سے ان کا لباس اتر گیا تو انہیں اپنے ستر کو چھپانے کی ضرورت محسوس ہوئی" (۱۲)

یہی بات ایک اور مقام پر مزید وضاحت سے بیان کرتے ہیں، کہ "اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم آیا "ولا تقربا ھذہ الشجرة" (البقرہ/۳۵) اور تم دونوں اس درخت کے قریب نہ جانا۔۔۔۔۔۔ علمائے ظاہر کا خیال ہے کہ شجرہ سے مراد گندم یا انگور ہے، حالانکہ اس سے مراد بی بی حوا کا جسم ہے، جس طرح شجر سے ثمر پیدا ہوتا ہے اسی طرح عورت کے جسم سے اولاد پیدا ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ نے بی بی حوا کو شجرہ اور اس کی اولاد کو ثمر سے تشبیہ دی ہے اور پھر قرآن میں عورت کو کھیتی بھی کہا ہے "نساءکم حرث لکم" (البقرہ/۲۲۳) (تمہاری عورتیں تمہارے لیے کھیتی ہیں) شجر ممنوعہ کے قریب نہ جانے کا مطلب زن وشوئی سے بچنا ہے"(۱۳)

خالق کا اپنی مخلوق سے تعلق کے حوالے سے خواجہ فرید نے دوران گفتگو قرآنی آیت "انا عرضنا الامانة علی السمٰوٰت ..... انه کان ظلوما جھولا" (الاحزاب/۷۲) سے کس طرح ایک سوال کے جواب میں استدلال کیا ہے وہ ملاحظہ ہو، کپتان واحد بخش سیال مترجم اشارات فریدی لکھتے ہیں:

"ایک دفعہ خواجہ صاحب کی مجلس میں کسی نے دریافت کیا کہ جب وحدت الوجود حق ہے اور ذات حق سے کوئی چیز باہر نہیں تو پھر کیا اللہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تعالیٰ ہر چیز میں اپنی جمیع صفات کمال کے ساتھ موجود ہے؟ آپ نے جواب دیا کہ ذات حق جمیع صفات کے ساتھ ہر چیز میں موجود نہیں، اس وجہ سے کہ ادنیٰ اشیاء میں یہ استعداد نہیں ہے کہ جمیع صفات کمال کی متحمل ہوسکیں، اس لیے محض پرستی یا بت پرستی حرام ہے، نیز چونکہ انسان کا قلب عام اشیاء سے زیادہ استعداد کا مالک ہے اس لیے حق تعالیٰ کی صفات کمال کا کسی حد تک متحمل ہوسکتا ہے، لیکن جملہ صفات کمال کا کلی طور پر ہرگز متحمل نہیں ہوسکتا، یہ اسی استعداد کی وجہ سے ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنی امانت یعنی خلافت ارضی کو آسمان، زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا تو سب نے انکار کردیا اور متحمل ہونے سے اقرار عجز کیا "وحملها الانسان انه كان ظلوما جهولا" (الاحزاب/۷۲) (اور انسان نے وہ امانت قبول کرلی اس وجہ سے کہ وہ ظلومی اور جہولی تھا) فرشتے اس لیے منصب خلافت قبول نہ کرسکے کہ وہ سراپا نور تھے، زمین اور پہاڑ اس لیے قبول نہ کرسکے کہ سراپا ظلمت تھے، لیکن چونکہ حضرت انسان روح اور جسم کا مجموعہ تھا اس کا ایک پہلو نورانی تھا اور ایک ظلمانی، اس وجہ سے وہ ذات حق کی صفات کا عکس قبول کرنے کے لیے مثل آئینہ کی صلاحیت رکھتا تھا انه كان ظلوما جهولا سے مراد یہ نہیں کہ وہ ظالم اور جاہل تھا بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس کی ایک طرف یا جہت نورانی تھی اور دوسری تاریک، اس لیے وہ آئینہ حق نما بن سکتا تھا یا بن چکا تھا۔۔۔۔۔ نیز آیت مذکورہ کے سیاق وسباق پر غور کیا جائے تو کلمات ظلوماً جهولا ستائشی ہیں نہ کہ الزامی(۱۴)

خواجہ فرید نے اسی آیت کی ایک اور تشریح بھی کی ہے جو مذکور تشریح سے مختلف ہے چنانچہ علامہ سعیدی لکھتے ہیں، خواجہ فرید نے اس آیت کا دوسرا مفہوم اس طرح بیان کیا ہے۔۔ امانت سے مراد وہی امانت ہے جو قرآن کی اس آیت میں بتائی گئی ہے، "انا عرضنا الامانة

على السموات والارض ... انه كان ظلوما جهولا" (الاحزاب/۷۲) یعنی امانت دینے سے مراد مرتبۂ جامعیت ہے اور یہ اشارہ ہے ربوبیت، مربوبیت، حقیقت، خلقیت جیسی صفات کی طرف، آسمانوں سے مراد عالم علوی یا فرشتے ہیں، زمین سے مراد عالم سفلی اور جبال سے مراد وہ ہے جو آسمان اور زمین کے درمیان ہے (یعنی نفسانی کرے) مگر تمام علوی وسفلی عالمین نے اس امانت کو سنبھالنے، قبول کرنے سے انکار کردیا، کیونکہ ان میں اس امانت کو سنبھالنے کی قوت وہمت نہیں تھی، اس لیے اس بھاری بوجھ کو اٹھانے سے زمینی، آسمانی اور جبالی مظاہر ڈر گئے، لیکن انسان کہ جس کی فطرت میں اس امانت کو اٹھانے کی صلاحیت اور طاقت تھی اس نے یہ امانت اٹھائی، تبھی فرمایا گیا کہ انسان ظلومی ہے یعنی اپنی جان کو مجاہدے اور ریاضت سے چور چور کرنے والا، اپنی ذات وصفات کو اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات میں فنا کرنے والا اور اللہ تعالیٰ کے سوا ہر شے کو بھلانے والا ہے، مطلب یہ کہ انسان آئینے کی طرح ہے اس کا ایک پہلو نور اور دوسرا پہلو ظلمت ہے، انسان میں نور وظلمت کے اجتماع کے سبب اس میں اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے عکس کو قبول کرنے کی صلاحیت موجود تھی، اسی صلاحیت ولیاقت کو ظلوما جهولا کہا گیا ہے(۱۵)

یہ تو معلوم ہے کہ ۵ جلدوں پر مشتمل "اشارات فریدی" آپ کے ملفوظات ہیں اور یہ بھی کہ مجلس میں ہر نوع کے سوالات کیے جاتے تھے اور آپ کے جواب کی ابتداء قرآنی آیت، حدیث یا دینی حوالے پر ہوتی تھی، ایک دفعہ موسلا دھار برستی بارش کے دوران بارش پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ایک خاص مقدار کی بارش برساتا ہے اور پھر سورۂ مؤمنون کی ایک آیت کا یہ حصہ پڑھا "وانزلنا من السماء ماءً بقدر فاسكنه في الارض" (المومنون/۱۸) (اور ہم آسمان سے ایک خاص مقدار میں پانی برساتے ہیں اور اسے زمین میں ٹھہرا دیتے ہیں) پھر فرمایا کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین بارش کے سارے پانی کو جذب نہیں کرتی بلکہ ایک خاص مقدار کو جذب کرتی ہے، باقی پانی زمین پر انسان کی ضروریات کے لیے زمین کی سطح پر ندی نالوں، دریاؤں نہروں، جھیلوں، جوہڑوں اور ٹوبھوں (تالابوں) میں تقسیم ہوجاتا ہے جس سے انسان مختلف نوعیتوں میں فائدہ اٹھاتا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ زمین کی پشت پر انسانوں، حیوانوں اور پرندوں کے لیے پانی کو ذخیرہ کردیتا ہے جس کی تائید اس آیت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے ہوتی ہے "وانزلنا من السماء ماءً فاسقینٰکموہ وما انتم لہ بخزنین" (الحجر/۲۲) (پس ہم ہی برساتے ہیں آسمان سے پانی اور ہم ہی پلاتے ہیں تمھیں اس کا پانی، اور تم تو اسے جمع کر کے نہیں رکھتے(۱۶)

خواجہ فرید کے استحضار علمی اور نکتہ آفرینی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ وہ محفل میں بغیر کسی سابقہ تیاری اور بغیر کسی مطالعہ کے (حالانکہ نوابان بہاولپور کی عظیم لائبریری کے بعد آپ خود بہت بڑی ذاتی لائبریری کے مالک تھے) علماء وفضلاء کی موجودگی میں مختلف عنوانات پر فی البدیہہ گفتگو کرتے تھے، اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کا مطالعہ دین ومذہب، تصوف، انساب، تقابل ادیان، تاریخ، جغرافیہ، حیاتیات اور فلکیات میں بہت گہرا تھا اور ساتھ ہی استنباط اور نتیجے کے استخراج میں بھی کمال کی قدرت رکھتے تھے، طرہ یہ کہ وہ مدبرانہ فکر کے حامل تھے، اس لیے بعض معاملات میں ان کا تدبّر اور ان کی نکتہ سنجی اظہر من الشمس ہے، مثال کے طور پر مشکوٰۃ شریف پڑھاتے وقت جب ایک حدیث میں یہ الفاظ آئے راس الکفر نحو المشرق (کفر کا سر مشرق کی جانب ہے) تو فرمایا کہ "نحو المشرق" سے مراد قوم ترکان تاتار ہے جس کے سردار چنگیز خان اور ہلاکو خان تھے، ترکانوں کے یہ تمام قبائل کافر تھے جو یاجوج وماجوج کے نام سے موسوم تھے یہ لوگ ملک تاتار چین سے آئے تھے جو عرب شریف کے مشرق میں ہے نیز کرۂ ارض کا انتہائی مشرقی حصہ ہے اس لیے نحو المشرق سے اسی کی طرف اشارہ ہے، انہوں نے خراسان، ایران اور بغداد پر قبضہ کیا اور تباہ وبرباد کر ڈالا، اس لیے آنحضرت ﷺ نے پیشگوئی فرمائی کہ سر مشرق میں ہے(۱۷)

اسی طرح ایک مرتبہ مشکوٰۃ شریف پڑھاتے وقت عبدالرحمٰن بن سلیمان سے مروی یہ روایت آئی کہ "قریب ہے کہ عجم سے ایک بادشاہ آئے گا اور تمام ممالک پر قبضہ کر کے مسلط ہو جائے گا، مگر ایک شہر دمشق اس کے تصرف میں نہیں آئے گا اور وہ اس پر غالب نہیں ہو سکے گا" تو حدیث کی بابت فرمایا یہ حدیث صریحاً چنگیز خان کے پوتے ہلاکو خان کے حق میں ہے جو کافر، جابر اور مسلمانوں کا دشمن تھا، اس نے ماوراء النہر، سمرقند، بخارا، غزنی، بغداد وغیرہ کو ظلم وستم سے تاراج کیا، پھر اسی ہلاکو کا بیٹا مسلمان ہوا اور سلطان احمد کے لقب سے مشہور ہوا، اس کے بھتیجے کا

بیٹا سلطان ابوسعید بہت ہی عادل بادشاہ تھا، روم سے دریائے جیحون تک اس کی سلطنت تھی اور خطبے میں اس کا نام پڑھا جاتا تھا، جب کہ چنگیز خان اپنے آپ کو پیغمبر کہتا تھا، چونکہ وہ اسلام دشمن تھا اس نے بیشمار مسلمانوں کو شہید کیا اور یہی کچھ ہلاکو نے کیا۔ ملخصاً(۱۸)

خواجہ فرید کی شہرت روز بروز ارتقاء پذیر ہے، انہوں نے مرکزی شہروں سے دور ایک پسماندہ علاقے میں رہتے ہوئے شہرت کی اوج ثریا پر کمند ڈالی، جبکہ ان کے چاروں طرف نابغہ روزگار شخصیات کے مراقد اور مسندیں موجود تھیں، جیسے بابا فرید گنج شکرؒ، قبلۂ عالم کے نام سے مشہور خواجہ نور محمد مہارویؒ (چشتیاں) خواجہ خدا بخش خیر پوریؒ، محکم الدین سیرانیؒ، پنجن پیرؒ، شیخ عبدالستارؒ، حضرت مجروحؒ، چھٹہ بھٹیؒ، شاہ رکن عالمؒ، بہاؤالدین زکریاؒ، حافظ جمال اللہ ملتانیؒ، عبدالعزیز پرہارویؒ، شاہ سلیمان تونسویؒ، نور محمد نارووالیؒ (حاجی پور) مٹھو مبارکؒ اور سخی سرورؒ اور مشائخ اوچ شریف وغیرہ، ان مرجع خلائق مراکز کے درمیان میں سے خواجہ غلام فرید کا ابھر کر سامنے آنا اور شہرت کے افق پر چھا جانا یہ معمولی بات نہیں ہے بلکہ یہ سب ان کے علم وفضل کا کمال ہے۔

کپتان واحد بخش سیال مترجم اشارات فریدی لکھتے ہیں: "خواجہ غلام فرید کے تبحر علمی اور شان معرفت کا یہ عالم تھا کہ دور دراز علاقوں سے علماء اور فضلاء اور درویش حاضر ہو کر ادق مسائل دریافت کرتے تھے"

صاحب ہفت اقطاب مولانا غلام جہانیاں معینی لکھتے ہیں کہ: "بحر العلوم حضرت مولانا شاکر محمد ڈیروی اپنے وقت کے بے نظیر اور جلیل القدر علماء میں سے تھے، چند ماہ حضور (خواجہ فرید) کی خدمت اقدس میں بغرض استفادہ وحصول فیض رہے ایک عرصہ بعد کسی دوست نے حضرت مولانا سے دریافت کیا کہ اس عرصہ میں آپ نے کیا کچھ حاصل کیا ہے؟ تو حضرت مولانا نے جواب میں فرمایا کہ ابھی تک تو لا الہ الا اللّٰہ کا معنی پورا نہیں ہوا"(۱۹)

اسی طرح اپنے عہد کے شمس بازغہ اہل علم دیوان ولایت علی شاہ اوچ بخاری، دیوان خیر شاہ، حیدر بخش اور دیگر باکمال علماء وصوفیاء آپ کے تلمیذ ومرید تھے، حضرت مولانا محمد مسلم علی پوری جو وقت کے جید عالم تھے جن کی خدمت میں کثیر التعداد طلباء دورۂ حدیث تفسیر وکتب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

معقول پڑھتے تھے وہ فرماتے ہیں کہ "جب خواجہ فرید نے مجھے لاالٰہ الااللہ کا معنی سمجھایا تو میں نے خود کو ان کے سامنے طفل مکتب پایا" اسی طرح کثیر التعداد امراء و روساء اور والیان ریاست بھی آپ کے حلقہ ارادت میں داخل تھے، نواب صادق محمد خان رابع والی ریاست بہاولپور، نواب قیصر خان مگسی والی ریاست جھل مگسی (بلوچستان) نواب محمد اکبر خان بگٹی کے والد، ریاست ٹونک کے نواب عبد العلیم خان، ٹانک (ڈیرہ اسماعیل خان) کے سردار کے علاوہ بہادر شاہ ظفر کے پڑپوتے شہزادہ احمد اختر بھی خواجہ فرید کے مرید تھے۔ ملخصاً (۲۰)

خواجہ فرید کے ملفوظات "اشارات فریدی" کی اہمیت کی سات وجوہات مترجم الحاج کپتان واحد بخش سیال نے مقدمہ میں تحریر فرمائی ہیں اور ہم صرف پہلی وجہ نقل کر کے اس مضمون کو ختم کر رہے ہیں:

> "اشارات فریدی کی اہمیت کی پہلی وجہ یہ ہے کہ عہد حاضر کے نظریہ لادینیت (secularism) اور مادہ پرستی (Materialism) کے طوفان نے تمام مذاہب کی روحانی اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کو ختم کر کے ساری دنیا میں جس بہیمیت کا دور قائم کر دیا ہے، اس کے قلع قمع کے لیے روحانیت اسلام سے زیادہ موثر ہتھیار کوئی اور طاقت نہیں ہے، چونکہ اشارات فریدی عصر حاضر کے ایک ایسے متبحر عالم، ولی کامل کے ارشادات کا مجموعہ ہے جو علوم قدیم و جدید میں مہارت تامہ رکھنے کے علاوہ عصر حاضر کے تمام مسائل و معاملات سے بھی بخوبی آگاہ تھے، آپ کے یہ روحانیت سے لبریز اور علمی شاہکار ملفوظات تہذیب مغرب کے تمام زہر آلود نظریات کے لیے تریاق کا اثر رکھتے ہیں" (۲۱)

خواجہ غلام فرید کا وصال ۷ ربیع الثانی ۱۳۱۹ھ مطابق ۲۴ جولائی ۱۹۰۱ء کو ہوا، آپ کا مدفن کوٹ مٹھن شریف میں مرجع خلائق ہے۔ (۲۲)

حواشی و حوالہ جات

۱۔ مقابیس المجالس جلد ۲، ص ۲۰۷، مطبوعہ الفیصل ناشران و تاجران، کتب اردو بازار، لاہور سن ندارد

۲۔ مقابیس المجالس جلد ۲، ص ۳۴۲، مطبوعہ الفیصل ناشران و تاجران، کتب اردو بازار، لاہور سن ندارد

۳۔ مقابیس المجالس جلد ۲، ص ۸۸۶ـ۸۸۸، مطبوعہ الفیصل ناشران و تاجران، کتب اردو بازار، لاہور سن ندارد

۴۔ طالوت، علامہ نسیم، مقدمہ دیوان فرید ص ۸۷، مطبوعہ صادق الاخبار پریس، بہاولپور سن ۱۹۴۳ء

۵۔ سعیدی، محمد اعظم، خواجہ فرید، سائنسی پر کو پرچول ص ۴۳، مطبوعہ سرائیکی ادبی سنگت کراچی ۲۰۰۴ء

۶۔ سعیدی، محمد اعظم، خواجہ فرید، سائنسی پر کو پرچول ص ۴۸، مطبوعہ سرائیکی ادبی سنگت کراچی ۲۰۰۴ء

۷۔ عزیز الرحمن، مولانا، شارح دیوان فرید، پیش لفظ ص ۱، مطبوعہ مذکور ۱۹۴۳ء

۸۔ مقابیس المجالس جلد ۳، ص ۵۴۲ تا ۵۴۹ مطبوعہ مذکور، اس موضوع پر تفصیل کے لیے راقم کا مضمون بعنوان ''الاُمّی کے معنی کی تحقیق اور اس کے اطلاقات'' ملاحظہ کیجئے جو سہ ماہی التفسیر، کراچی میں جلد ۲ شمارہ ۲ (2005ء) کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔

۹۔ دیوان فرید سرائیکی کافی نمبر ۷۷، ۱۸، مطبوعہ مذکور ۱۹۴۳ء

۱۰۔ سعیدی، محمد اعظم، خواجہ فرید، سائنسی پر کو پرچول ص ۷۱-۷۲، مطبوعہ مذکور ۲۰۰۴ء

۱۱۔ سورۃ الاعراف آیت نمبر ۳۲　　۱۲۔ مقابیس المجالس، جلد ۵، ص ۱۰۵۶، مطبوعہ مذکور

۱۳۔ مقابیس المجالس، جلد ۲، ص ۹۱۸، مطبوعہ مذکور، علامہ رحمت اللہ طارق نے اسی موضوع پر ایک مدلل مضمون تحریر فرمایا ہے جس کا عنوان ہے انجرہ سے نسوانی جسم کا مقام خاص مراد ہے۔ ملاحظہ کیجئے، تفسیر برہان القرآن ص ۱۶۲ تا ص ۱۶۷، ادارہ ادبیات اسلامیہ، ملتان۔

۱۴۔ سیال، واحد بخش، کپتان، مقدمہ مقابیس المجالس، ص ۲۰-۲۱، مطبوعہ مذکور

۱۵۔ سعیدی، محمد اعظم، خواجہ فرید، سائنسی پر کو پرچول ص ۶۵-۶۲، مطبوعہ مذکور، اس آیت کی تشریح علمائے کرام نے مختلف انداز میں کی ہے خواجہ غلام فرید کی تشریح بھی عام مفسرین سے اس لیے مختلف ہے۔ بہر حال اس آیت پر مفسرین کرام کی تشریحات کے ساتھ ایسے عالمانہ تجزیہ کی ضرورت ہے جو تحقیقی اسلوب کا حامل ہو، اور راقم کے لیے سر دست یہ ناممکن ہے۔ ہاں مستقبل میں ضرور ممکن العمل ہے۔ (ان شاء اللہ)

۱۶۔ سعیدی، محمد اعظم، خواجہ فرید، سائنسی پر کو پرچول ص ۷۶ تا ۷۷، مطبوعہ مذکور

۱۷۔ مقابیس المجالس جلد ۵، ص ۹۳۱، مطبوعہ مذکور　　۱۸۔ مقابیس المجالس جلد ۵، ص ۶۲۵-۶۲۶، مطبوعہ مذکور

۱۹۔ محمد سیال، واحد بخش، کپتان، مقدمہ مقابیس المجالس، ص ۷۷، مطبوعہ مذکور

۲۰۔ ایضاً، ص ۸۷　　۲۱۔ ایضاً، ص ۹۰، مطبوعہ مذکور

۲۲۔ سعیدی، محمد اعظم، خواجہ فرید، سائنسی پر کو پرچول ص ۱۳، مطبوعہ مذکور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

التفسیر، مجلس تفسیر، کراچی جلد ۹، شمارہ ۲۰، اپریل تا ستمبر ۲۰۱۲ء

اقبال کا علمِ کلام اور اس کی نوعیت

ڈاکٹر محمد آصف

Allama Iqbal, in actual, is a Schoolman / Scholastic. The modern Scholasticism that was founded by Sir Syed and that was propagated by Shibli and Syed Amir Ali, Iqbal not only complemented it but also stablised its growth. He made religion and science embrace each other. He uprooted skepticism in philosophy and vindicated the believes and theories of Islam in the light of modern knowledge and arts. In this way he gave a genesis to Islamic thought. This is the achievement of Iqbal that he motivated the centuries old scholasticism by harmonizing it with scientific era. He purified it from the passiveness of non-Arabic mysticism and Greek thoughts. He guided us towards the concept of collective self and modernism in Pakistan.

فلسفہ اور علمِ کلام دونوں "مربوط"، "مدلل" اور "منطقی و عقلی" نظامِ فکر کو پیش کرتے ہیں اور دونوں کا مقصد ایک قابلِ عمل نظامِ حیات کو پیش کرنا ہے تاہم دونوں میں ایک نازک مگر ایک پیچیدہ سا فرق پایا جاتا ہے اور یہی فرق دونوں کی حدوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتا ہے۔ فلسفہ تمام تر عقائد و نظریات اور مذہبی جکڑ بندیوں سے آزاد غور و فکر کا نام ہے۔ یہ آزادی سے کسی نظریے یا نتیجے تک پہنچتا ہے اور اس نتیجے میں شک و شبہ اس کا وصف ہے یعنی پہلے آزادی سے تدبر و تفکر کرنا اور پھر کسی نتیجے تک پہنچنا اس کی خصوصیت ہے۔ بقول علی عباس جلال پوری "فلسفہ ایک مستقل آزاد اور مسلسل ذہنی کاوش کا نام ہے جسے کسی مخصوص عقیدے کی حدود میں مقید نہیں کیا جاسکتا"(۱) جبکہ علمِ کلام میں مخصوص عقائد و نظریات کی روشنی میں کائنات کی توجیہہ عقل و استدلال کے ذریعے پیش کی جاتی ہے۔ شک کی بجائے یقین اور آزادی کی بجائے پابندی اس کا وصف ہے۔ بقول سید سلیمان ندوی:۔

> "علمِ کلام اس علم کا نام ہے جس میں اسلامی عقائد (یا مخصوص مذہبی عقائد) کو دلائلِ عقلیہ سے ثابت کیا جاتا ہے"(۲)

آزادی و شک، یقین و پابندی کا فرق علی عباس جلال پوری نے بڑے واضح انداز میں پیش کیا ہے:۔

> "علمِ کلام کیا ہے؟ پہلے عقیدہ رکھنا پھر غور و فکر کرنا۔ جو شخص آزادانہ غور و فکر کرنے کے بعد کوئی عقیدہ اختیار کرے گا وہ متکلم نہیں رہے گا فلسفی کہلائے گا"(۳)

سقراط، افلاطون اور ارسطو کا زمانہ فلسفہ کا دورِ زریں کہلاتا ہے۔ ان جید یونانی فلاسفہ نے اپنے نظریات و افکار سے تہذیب و تمدن میں نئی روح پھونکی اور حقیقت یہ ہے کہ علم و ادب، سیاست و عمرانیات، تاریخ و مذہب میں انہیں کے نظریات نے نت نئی تحریکوں کی شکلیں اختیار کیں۔ اسی دوران ایسے مکتبہ ہائے خیال نے بھی جنم لیا جن کی آزادہ روی اور تشکیک نے مدتوں عقائد کو شکست و ریخت سے دوچار کیا۔ اسی کو فلسفہ کہا گیا۔ گویا فلسفہ شک و شبہ کی کوکھ سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جنم لیتا ہے۔ مذہب اور عقائد کے ایقان و ایمان کے بغیر پنشو ونما پاتا ہے۔

علم کلام نے فلسفے کی کوکھ سے جنم لیا ہے اور اس کا احسان یہ ہے کہ اس نے یونانی اثرات سے مسلم فکر کو نجات دلائی۔ فلسفہ کی تکنیک کا خاتمہ کر کے مذہب کی حقانیت کو عقل سے ثابت کیا۔ (۴) چنانچہ ابوالبرکات، امام رازی، امام غزالی، علامہ آمدی، ابن تیمیہ، اسی طرح فارسی شعراء مثلاً رومی، سنائی، عطار، حافظ، صائب، عرفی، حافظ وغیرہ نے اپنے عقائد ونظریات کے تحت اسلامی فکر کو عقلی دلائل سے ثابت کیا۔ ان میں رومی، غزالی اور رازی نے محض عقل کی بجائے عملی نتائج سے اسلامی فکر کا اثبات کیا (۵)

علم کلام اور فلسفے کی تاریخ میں عباسی دور بے حد اہمیت کا حامل ہے۔اس دور میں ایک طرف ایرانی اور یونانی فلسفے عربی میں منتقل ہوئے تو دوسری طرف مغربی اقوام سے تہذیبی و ثقافتی رشتے بھی استوار ہوئے۔ جس کے نتیجے میں بے شمار علمی سوالات نے جنم لیا، عقائد و ایمان کی عمارتوں میں دراڑیں پڑنے لگیں اس کے ساتھ ہی مغربی اقوام اور مستشرقین نے فلسفے کے ذریعے اسلام کی بنیادوں کو اکھیڑنے کی کوشش کی۔ مسلمانوں کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ ''فلسفے کے ذریعے ہی فلسفے کا رد کریں۔ اس فکری اور ذہنی آویزش نے ابو مسلم، ابوبکر، ابوالقاسم اور اس طرح کے دوسرے متعدد علماء کو آگے بڑھایا۔ انہوں نے مغربی خیالات و افکار کے بطلان کے لیے قرآن کی تفاسیر کے علاوہ دیگر ایسی کتب پیش کیں جنہوں نے ''ایک جدید علم کلام سے پہلی مرتبہ ساری دنیا کو آشنا کیا'' چنانچہ رازی، غزالی، ابن رشد، قاضی عضد یہ سب اسی رجحان عقلیت کی نمائندگی کرتے ہیں۔ فلسفے کا یہ جدید انداز یعنی علم کلام تیزی سے مصر، شام، ترکی اور دوسری اسلامی سلطنتوں میں پھیلتا چلا گیا۔ اسے فلسفے سے علیحدہ ایک علم یعنی علم کلام تصور کیا جانے لگا اور اس میں اتنی تیزی سے ترقی و توسیع ہوئی کہ ''یونانی و ایرانی فلسفہ کا آہنی قلعہ ذرا سی جنبش سے مسمار ہو گیا۔'' (۶)

مغربی علوم وفنون، نظریات اور تہذیب و ثقافت کے عمل دخل کی بدولت ہندوستان میں جس قدیم و جدید کی آویزش نے جنم لیا اس میں جدید علم کلام کی ضرورت و اہمیت کا

احساس سب سے پہلے سرسید نے کیا۔ یہی احساس تھا جس نے ان سے خطبات احمدیہ، تفسیر القرآن اور تبیین الکلام جیسی تالیفات تصنیف کرائیں۔ سرسید چاہتے تھے کہ مسلمان عقائدِ مذہبی، تاریخ اسلام اور اسلام کے شیوخ سے بھی آگاہ ہوں اور مغربی علوم سے بھی۔ دوسرے لفظوں میں سرسید اسلام اور مسلمانوں کے تحفظ اور ترقی کے لیے مذہب اور سائنس کا ملاپ کرا کے ایک نئے علم کلام کی بنیاد رکھنا چاہتے تھے۔ اس لیے انہوں نے کہا تھا:

> ''اس زمانے میں ایک جدید علم کلام کی حاجت ہے جس سے یا تو ہم علوم جدیدہ کے مسائل کو باطل کر دیں یا مشتبہ ٹھہرا دیں یا اسلامی مسائل کو ان کے مطابق کر دکھائیں کہ اس زمانے میں صرف یہی صورت حمایت اور حفاظت اسلام کی ہے۔'' (۷)

اس کے تحت ''سرسید نے اسلام کی ایسی ترجمانی کی جس پر عمل، سمجھ اور جدید فلسفے کی رو سے کوئی اعتراض نہ ہو سکے۔'' (۸)

غرض سرسید نے جدید علوم وفنون، اسلام کی نئی تعبیر وتشریح، محنت وعمل، عقلیت و نطرت، اجتہاد، روشن خیالی اور علیحدہ قومیت پر مبنی خیالات پیش کیے اور ان کو عملی جامہ پہنایا۔ ان کی اصلاحی کوششیں تعلیمی، سیاسی، مذہبی امور تک محدود نہ تھیں بلکہ انہوں نے اردو ادب کو بھی اجتماعی مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہوئے علمی افکار کی اشاعت کا ذریعہ بنایا اور اسے بھی عقلیت و نطرت اور افادیت کی بنیادوں پر استوار کیا۔ یہاں تک کہ خود اقبال نے بھی اس رائے کا اظہار کیا کہ ''سرسید پہلے ہندوستانی مسلمان ہیں جنہوں نے اسلام کو جدید رنگ میں پیش کرنے کی ضرورت محسوس کی۔'' (۹)

جدید علم کلام کو فروغ دینے میں جن لوگوں نے سرسید کا ساتھ دیا ان میں مولوی چراغ علی، شبلی، سید امیر علی، مولوی نذیر احمد اور حالی پیش پیش تھے (علم کلام کے حوالے سے ان میں بالخصوص شبلی اور سید امیر علی)۔ سرسید کی انتہا پسندی کے برعکس شبلی پرانی روشنی کو نئی روشنی میں جلوہ گر دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ مشرق ومغرب دونوں سے مرعوب ہوئے بغیر اور اندھی تقلید کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

برعکس دونوں کے صحت مند اجزاء کے ملاپ کے قائل تھے۔ بقول مہدی افادی ''انہوں نے مذہب اور سائنس دونوں میں مصالحت کرا دیا۔''(۱۰)

سید امیر علی نے ''روح اسلام'' کے ذریعے ''اسلام کی سائنسی روح'' اور ''اسلام کی فلسفیانہ روح'' کو پیش کیا۔ ''روح اسلام'' اور ''تاریخ اسلام'' دونوں کو مدنظر رکھا جائے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ سید امیر علی کا موضوع اسلام اور مغرب کے تقابلی مطالعے کے ذریعے روح اسلام کو اشکار کرنا ہے۔(۱۱) عہد جدید میں اقبال وہ مفکر ہیں جنہوں نے اپنی شاعری اور نثر میں ایک مربوط، مدلل، عقلی اور قابل عمل نظام فکر اور نظام حیات پیش کیا۔

عصر حاضر میں جس جدید علم کلام کی بنیاد سرسید نے رکھی تھی اور جسے شبلی اور سید امیر علی نے پروان چڑھایا تھا اقبال نے اس کی تکمیل کر دی۔ سرسید نے مذہب کے مقابلے میں سائنس اور عقل کو برتر قرار دیا تھا۔ سرسید تہذیب مغرب سے مرعوب ہو گئے تھے۔ مادہ پرستی کا عنصر غالب آگیا تھا لیکن اقبال نے شبلی اور سید امیر علی کے طریق فکر کو آگے بڑھاتے ہوئے سرسید کے طریق فکر میں توازن پیدا کیا۔ انہوں نے اپنی ساری توجہ اسلام کے بنیادی اصولوں کو آشکار کرنے میں صرف کی اور اسلامی روایات کو مجروح کیے بغیر دینی مسائل کا جدید افکار کی روشنی میں اثبات کیا۔(۱۲) اور اس نقطہ نظر کا اظہار کیا کہ:

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا تقاضا ہے کہ ہر شب کو سحر کر(۱۳)

اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا واقعی اقبال کا طریق کار ایک فلسفی کا ہے یا متکلم کا۔ اس مقصد کے لیے اقبال کے خطبات کی طرف رجوع کریں۔ سب سے پہلے خطبات کے عنوان کو لیجئے۔ ''The Reconstruction of Religious thoughts in Islam'' (تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ) گویا خطبات کا مقصد ہی یہ ہے کہ اسلامی فکر کی نئی تشکیل کی جائے۔ چنانچہ اقبال نے مذہبی علوم کو سائنٹفک صورت دینے کے مطالبے کو پورا کیا ہے۔ خطبات کے دیباچے میں تحریر فرماتے ہیں:

''یہ مطالبہ کیا غلط ہے کہ مذہب کی بدولت ہمیں جس قسم کا علم حاصل ہوتا ہے اسے سائنس کی زبان میں سمجھا جائے............ میں نے اسلام کی روایات فکر، علی ھذا ان ترقیات کا لحاظ رکھتے ہوئے جو علم انسانی کے مختلف شعبوں میں حال ہی میں ہوئیں۔ الٰہیات اسلامیہ کی تشکیل جدید سے ایک حد تک پورا کرنے کی کوشش کی ہے............ وہ دن دور نہیں کہ مذہب اور سائنس میں ایسی ایسی ہم آہنگیوں کا انکشاف ہو جو سردست ہماری نگاہوں سے پوشیدہ ہیں۔''(۱۴)

اس طرح اقبال جدید سائنس اور مذہب کو ہم آہنگ کر کے رازی، غزالی، رومی اور پھر شبلی کی طرح متکلم ہونے کا ثبوت دیتے ہیں۔ آگے چل کر اقبال فرماتے ہیں ''فلسفیانہ غور و فکر میں قطعیت کوئی چیز نہیں۔''(۱۵) اس جملے میں اقبال نے فلسفیانہ غور و فکر کا نام لیا ہے جس سے محسوس یہ ہوتا ہے کہ اقبال اس عبارت میں فلسفے کی بات کر رہے ہیں اور اوپر والی بیان کردہ عبارتوں میں علم کلام کی۔ یوں اسی دیباچے میں ایک تضاد سا محسوس ہوتا ہے لیکن ایسا نہیں ہے اقبال کے نزدیک فلسفہ نام ہی اس چیز کا ہے جو عقائد و نظریات کی توثیق جدید علم کی روشنی میں کرے۔ ایسا فلسفہ جو مذہب و وجدان کو ترک کر دے وہ مہلک ہے اور فلسفہ کے نام کا حقدار ہی نہیں ہے۔ اس لیے اقبال اپنے علم کلام کے لیے کبھی فلسفہ کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور کبھی علم کلام کا گویا اقبال کے نزدیک فلسفہ اور علم کلام ایک ہی چیز کے دو نام ہیں اور دونوں ایک دوسرے کے مترادف ہیں۔

چنانچہ فلسفیانہ قطعیت نہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ اقبال نے جو جدید تشکیل کی عمارت بلند کی ہے وہ حرف آخر نہیں ہے بلکہ وہ توقع رکھتے ہیں کہ جب بھی کبھی اس قسم کا ماحول رونما ہوگا تو دیگر محققین یا متکلمین یا فلاسفہ الٰہیات کی نئے سرے سے نئے حالات میں نئے تقاضوں کے مطابق تشکیل جدید کریں گے۔

اسی طرح اقبال کا درج ذیل بیان اسی دیباچے میں ہے کہ:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"ہمارا یہ فرض ہے کہ علوم انسانی کی ترقی پر نظر رکھیں اور ان کے متعلق آزادانہ اور ناقدانہ رویہ اختیار کریں۔"[۱۶]

ناقدانہ و آزادانہ رائے سے مراد فلسفیانہ آزادی نہیں بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ جب بھی کبھی نئے حالات اور علمی انکشافات رونما ہوں تو ان سے ایسے نظریات اخذ نہ کئے جائیں جو مذہبی نظریات کے خلاف ہوں بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ نئے حالات کی روشنی میں پوری آزادی سے، ناقدانہ انداز میں مذہبی عقائد کی توثیق ہو سکے۔[۱۷]

مندرجہ بالا دلائل کے علاوہ یہ بات بھی مدنظر رہنی چاہیے کہ اقبال مسلمان تھے، مسلمان رہنما تھا۔ اسلام کی حیات نو ان کا مقصد تھا۔ مسلم رہنما کی حیثیت سے وہ کبھی یہ نہ چاہیں گے کہ کسی دور میں بھی اسلام کے عقائد کو کوئی صدمہ پہنچے چنانچہ اقبال "آزادانہ اور ناقدانہ رویے" سے اور "عدم قطعیت" سے مراد اسلام کے اندر رہتے ہوئے پوری آزادی سے اسلام کے مسائل کی تجدید لیتے ہیں نہ کہ بطلان۔

اقبال جہاں کہیں فلسفہ کو برا کہتے ہیں اس سے مراد وہی فلسفہ ہوتا ہے جو وجدان و مذہب سے دور کرتا ہے۔ قاضی عبدالحمید لکھتے ہیں:۔

"اقبال کو فلسفے کے نام سے چڑ تھی۔ وہ اپنے آپ کو کبھی بھی فلسفی کہنا پسند نہیں کرتے تھے۔ دوران گفتگو بعض مرتبہ میرے منہ سے بلا ارادہ اگر ان کے لیے فلسفی اور ان کے خیالات کے لیے نظام فلسفہ کے الفاظ نکل گئے تو انہوں نے مجھے یہ کہہ کر ٹوک دیا کہ ان کے ہاں نظام فلسفہ نہیں ہے۔"[۱۸]

علی عباس جلال پوری نے اقبال کے انہی بیانات کی وجہ سے اقبال کو فلسفی کی بجائے متکلم قرار دیا ہے۔[۱۹] عشرت حسن انور نے اقبال کو ۲۰ ویں صدی کا سب سے بڑا متکلم کہا ہے جنہوں نے اسلامی الٰہیات کی تشکیل جدید کی۔[۲۰]

بعض نقادوں نے اقبال کو فلسفی قرار دیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں صدیوں سے کلام اور فلسفہ کو مترادف سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً سید وقار عظیم جیسے نامور نقاد کی کتاب "اقبال فلسفی اور شاعر" ملاحظہ کیجئے جس میں محض مربوط نظام فکر کی وجہ سے اقبال کو فلسفی قرار دیا گیا ہے۔[۲۱] بشیر احمد ڈار نے باقاعدہ طور پر علی عباس جلال پوری کی کتاب کے جواب میں اقبال کو فلسفی ثابت کیا ہے۔ ان کے نزدیک کوئی بھی فلسفی آزاد نہیں ہوسکتا متکلم کی طرح فلسفی بھی پہلے عقیدہ رکھتا ہے اور پھر فلسفہ تعمیر کرتا ہے۔[۲۲] انہوں نے فلسفیوں کے دو گروہ بنائے ہیں۔ مذہبی فلسفی جو مذہب کا اثبات کرتے ہیں۔ لادین فلسفی جو مذہب کا بطلان کرتے ہیں۔ اس گروہی تقسیم میں انہوں نے اقبال کو ایسا فلسفی قرار دیا جو مذہب کی حمایت میں فلسفہ پیش کرتا ہے۔[۲۳] لیکن مندرجہ بالا سطور میں کلام اور فلسفہ میں اقبال کے اپنے بیانات کی روشنی میں فرق کو واضح کیا جاچکا ہے اور ثابت کیا جاچکا ہے کہ اقبال ایک متکلم ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر عام معنوں میں عوام الناس کی زبان میں یہ کہا جائے کہ اقبال ایک فلسفی ہیں کیونکہ انہوں نے زندگی، خدا اور کائنات کے بارے میں اپنا ایک مربوط مدلل فلسفہ پیش کیا ہے تو عمومی طور پر یہ درست ہوگی تاہم جب فلسفہ اور علم کلام کی حدود، نوعیت، ماہیت اور طریق کار کو مدنظر رکھتے ہوئے علمی، اصطلاحی اور تکنیکی دائروں کو مدنظر رکھا جائے تو یقیناً اقبال ایک متکلم ہیں جیسا کہ مندرجہ بالا مباحث و دلائل سے ثابت ہے۔ مزید یہ بیان ملاحظہ کیجئے:۔

"فلسفی شکوک کی پیداوار ہوتے ہیں نہ کہ یقین کی، مثلاً سارتر رومن کیتھولک گھرانے میں پیدا ہوا۔ ہوش سنبھالنے کے بعد اس نے الحاد کی راہ اختیار کی۔ یہ الحاد ظاہر ہے یقین کی نہیں بلکہ شک کی پیداوار تھا۔ جو اس کے فلسفی ہونے کی دلیل ہے جبکہ اقبال یقین اور عقیدے پر اپنا نظام فکر پیش کرتے ہیں، پس وہ متکلم ہیں۔"[۲۴]

اقبال ایک متکلم ہیں یہ تو طے ہوگیا اب دیکھنا یہ ہے کہ ان کے علم کلام کی نوعیت کیا ہے؟ یہ مجہول ہے یا صحت مند۔ ان کے علم کلام پر علی عباس جلال پوری نے مختلف اعتراضات

© rasailojaraid.com

کیے ہیں مثلاً ''اقبال نے وحدت الوجود پر اپنی عمارت استوار کی۔''(۲۵) ''اقبال خرد دشمن ہیں۔''(۲۶) ''اقبال تخیلات و مراقبات کی دنیا میں رہنا پسند کرتے ہیں۔''(۲۷) اقبال ماضی سے مریضانہ دلچسپی رکھتے ہیں۔(۲۸)

اقبال کے کلام، خطبات، بیانات اور خطوط کا بالاستیعاب مطالعہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ اقبال نے وحدت الوجودی فلسفہ کے خلاف اپنا نظریہ خودی پیش کیا اور وجودی تصوف کے برعکس اسلامی تصوف کو صحیح شکل و صورت عطا کی۔ اقبال نے عقل و عشق کے موازنے میں دونوں کو لازم و ملزوم قرار دے کر عقل کی بنیاد عشق پر رکھی۔ وہ عقلی توجیہات ہی کی بنا پر سائنس کی برکتوں کے قائل ہیں اور مسلمانوں کی بیداری میں اسلامی اقدار کو سائنس کی ترقی کے ساتھ ہم آہنگ کرتے ہیں۔ عقل اور سائنس کی مخالفت اس وقت کرتے ہیں جب سامراج مظلوم اقوام پر غلبہ کے لیے ان کو استعمال کرتے ہیں۔ وہ رہبانی تصوف کے خلاف ہیں۔ اقبال رومان و تخیل کو شخصیت کا جزو سمجھ کر عمل کے پہلو کو فوقیت دیتے ہیں۔ وہ ماضی کی بنیادوں پر مستقبل کی عمارت استوار کرتے ہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ وہ ماضی کے ملبے میں دفن ہو کر رہ جائیں۔ مثلاً ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' (فکرِ اسلامی کی سائنسی بنیادوں پر نئی تشکیل)۔ اس کے علاوہ انہیں خطبات میں سے مندرجہ بالا صفحات میں جو سطور نقل کی جاچکی ہیں ان سے واضح ہوتا ہے کہ اقبال سائنس کو نظر انداز نہیں کرتے بلکہ وہ تو اسلام کو جدید سائنسی بنیادوں پر ڈھالتے ہیں۔
اسی طرح عقل کے بارے میں ملاحظہ کریں:

''اسلام کا ظہور .... سراسر عقل استقرائی کا ظہور ہے۔''(۲۹)

خودی کے بارے میں دیکھیے:

''یہ لفظ (خودی) اس نظم میں (اسرار خودی میں) بمعنی غرور استعمال نہیں کیا گیا بلکہ اس کا مفہوم محض احساس نفس یا تعیین ذات ہے۔''(۳۰)

اسی طرح ماضی کے متعلق صحت مند نظریہ دیکھیے:

''افراد کی صورت میں احساس نفس کا تسلسل قوت حافظہ سے ہے۔ اقوام کی صورت میں اس کا تسلسل و استحکام قومی تاریخ کی حفاظت سے ہے۔''(۳۱)

اس بیان میں نہ صرف خودی کے صحت مند نظریے پر روشنی پڑتی ہے بلکہ قوم کی تاریخ کے بارے میں بھی اقبال کا ایک صحت مند نظریہ ابھر کر سامنے آتا ہے۔ اب کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیں جن سے ہمارے بیانات کی مزید تصدیق ہوتی ہے۔

مشرق و مغرب کے منفی اور تخریبی عناصر کی مخالفت:

بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق و مغرب کے میخانے
یہاں ساقی نہیں پیدا وہاں بے ذوق ہے صہبا۔
مغرب ز تو بیگانہ، مشرق ہمہ افسانہ
وقت است کہ در عالم رنگ دگر انگیزی

منفی علم کلام اور اس کے مضر اثرات پر تنقید:

طبع مشرق کے لیے موزوں یہی افیون تھی
ورنہ قوالی سے کچھ کم تر نہیں علم کلام
ہے یہی بہتر ''الٰہیات'' میں الجھا رہے
یہ کتاب اللہ کی ''تاویلات'' میں الجھا رہے

وجودی تصوف اور بے عملی کی مخالفت:

مست رکھو ذکر و فکر صبحگاہی میں اسے
پختہ تر کردو مزاج خانقاہی میں اسے

عمل اور تخلیق مقاصد پر زور:

زندگانی را بقا از مدعا ست
کاروانش را درا از مدعا ست
زندگی در جستجو پوشیدہ است

© rasailojaraid.com

اصل او در آرزو پوشیدہ است

یہ چند مثالیں ہیں جو یہاں فراہم کی گئی ہیں ورنہ اقبال کا تمام کلام خطبات اور مقالات ایسے بیانات اور اشعار سے لبریز ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال نے صدیوں کے جامد علم کلام کو ہمارے سائنسی دور سے ہم آہنگ کر کے اسے تحرک عطا کیا ہے اور علی عباس جلال پوری کے اعتراضات غلط ہیں کہ اقبال جامد علم کلام کے علمبردار ہیں۔ مندرجہ بالا اشعار کا جائزہ لیا جائے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو زوال پذیر کرنے میں جہاں دیگر عوامل نے کردار ادا کیا ہے وہاں ایک سبب یہ بھی تھا کہ ان کا علم کلام، ''الٰہیات''، ''تاویلات''، ''افیون'' اور بتانِ عجم کا پجاری بن کر رہ گیا۔ ان کا ''جوہر ادراک'' گم اور ''شعر تحقیق'' کند ہو گیا۔ وہ کشتۂ سلطانی وملائی و پیری'' بن کر رہ گئے۔ ان کی آئینہ ضمیری ختم ہو گئی۔ (۳۸) ساقی نامہ کے یہ چند اشعار اس حوالے سے اہمیت کے حامل ہیں:۔

تمدن، تصوف، شریعت، کلام
بتانِ عجم کے پجاری تمام
حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ امت روایات میں کھو گئی
لبھاتا ہے دل کو کلامِ خطیب
مگر لذتِ شوق سے بے نصیب
بیاں اس کا منطق سے سلجھا ہوا
لغت کے بکھیڑوں میں الجھا ہوا
وہ صوفی کہ تھا خدمتِ حق میں مرد
محبت میں یکتا حمیت میں مرد
عجم کے خیالات میں کھو گیا
یہ سالک مقامات میں کھو گیا
بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے (۳۹)

اسی طرح اقبال کے علم کلام میں محض دشمنی اور مغرب دشمنی کے عناصر کہیں بھی موجود نہیں بلکہ انہوں نے تو مغرب کے صحت مند اجزا سے استفادے کی تلقین کی ہے۔ ان کے نزدیک مغربی تہذیب اسلامی تہذیب کے بعض پہلوؤں کی ترقی یافتہ شکل ہے اور اپنی سائنسی ترقی کے حوالے سے مغرب تحسین کے لائق ہے۔ مثلاً دیکھئے:۔

''آج مغربی اقوام اپنی قوتِ عمل کی وجہ سے تمام اقوام عالم میں ممتاز

ہیں۔'' (۴۰)

''پچھلے پانچ سو سالوں سے الٰہیاتِ اسلامیہ پر ایک جمود کی کیفیت طاری ہے وہ دن گئے جب یورپ کے افکار دنیائے اسلام سے متاثر ہوا کرتے تھے۔ بات یہ ہے کہ پچھلی متعدد صدیوں میں جب عالم اسلام پر ذہنی غفلت اور بے ہوشی کی نیند طاری تھی یورپ نے ان مسائل میں نہایت گہرے غور و فکر سے کام لیا جن سے کبھی مسلمان فلسفیوں اور سائنسدانوں کو شغف رہا ہے۔ قرونِ وسطیٰ سے لے کر اب تک جب اسلامی مذاہب الٰہیات کی تکمیل ہوئی انسانی فکر اور تجربے کی دنیا میں غیر معمولی وسعت پیدا ہو چکی ہے۔'' (۴۱)

''مغربی تہذیب دراصل اسلامی تہذیب ہی کے بعض پہلوؤں کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔'' (۴۲)

یہاں سید سلیمان ندوی کا یہ بیان ملاحظہ فرمائیں جس سے اقبال کے علم کلام کی جدیدیت اور عملیت ظاہر ہوتی ہے۔

''ڈاکٹر اقبال کی شاعری نے اسی تمدن، اسی تہذیب اور اسی فضا میں بال و پر کھولے ہیں۔ اس لیے انہوں نے اسلامی عقائد کا اثبات زیادہ تر عملی نتائج سے کیا ہے اور خودی کا جو فلسفہ ان کا مخصوص فلسفہ ہے اس سے انہوں نے ان مسائل کی تشریح و اثبات میں کام لیا ہے (جو ہمیں درپیش ہیں) اس لیے ان کا طرز بیان قدیم متکلم اور صوفی شعراء کے انداز بیان سے زیادہ اسی زمانے کے رجحان کے مطابق ہے۔'' (۴۳)

غرض اقبال کے علم کلام میں نہ بے عملی ہے، نہ الٰہیات و تاویلات کی بے جا بھرمار۔ نہ بتانِ عجم کی پوجا ہے، نہ ماضی کی مریضانہ پرستش۔ نہ خرد دشمنی ہے، نہ مغرب بیزاری۔ اس کے برعکس انہوں نے ملوکیت، ملائیت اور خانقاہیت کے سبب پیدا شدہ صدیوں کے یک رخے جامد،

© rasailojaraid.com